Fikr-o-Nasar (Islamabad) 20:2 (1982)

قیامِ پاکستان کے محرّکات

پروفیسر کرم حیدری

پاکستان اور قیام پاکستان کے بارے میں جب بھی ہم کچھ کہنا یا لکھنا چاہیں تو ہمیں مندرجہ ذیل تاریخی حقائق کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

۱۔ یورپی اقوام کی آمد سے پہلے گلگت سے لے کر راس کماری تک اور قندھار سے لے کر اراکان کی پہاڑیوں تک مسلمانوں کی حکومت تھی جس کا مرکزی دارالحکومت دِلّی تھا۔

۲۔ سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا اور ملک کے مختلف حصّوں میں علیحدہ خودمختار حکومتیں قائم ہونا شروع ہوئیں تو ایسی قائم ہونے والی تمام حکومتوں کے سربراہ مسلمان نواب تھے چنانچہ جنوب میں ارکاٹ اور ترچناپلی تک کے نواب اور مشرق میں بنگال کے حکمران مسلمان تھے۔

۳۔ صرف انیسویں صدی کے آغاز میں جب مسلمان حکمران یکے بعد دیگرے انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور راجپوتوں کی ناعاقبت اندیشوں کا شکار ہو رہے تھے اس وقت پنجاب میں رنجیت سنگھ کی سربراہی میں سکھوں کی حکومت قائم ہوئی مگر یہ حکومت بھی شاہ زمان خان والیٔ کابل کے فرمان کے ذریعے اسے ملی تھی اور اُس کی زندگی کے خاتمہ کے بعد چند سال بھی قائم نہ رہ سکی۔

۴۔ مسلمانوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی مملکتوں کو بچانے کے لئے بڑی جرأت اور پامردی

سے برطانوی سامراج کا مقابلہ کیا لیکن ایک تو باہمی نفاق اور افتراق کی وجہ سے اور دوسرے حربی ٹیکنالوجی میں پسماندگی کے باعث کامیاب نہ ہو سکے۔ اگر وہ وقت کے ساتھ ساتھ جنگی ٹیکنالوجی میں ترقی کرتے رہتے تو شاید برصغیر کو غلامی کا دور کبھی دیکھنا نہ پڑتا۔

۵۔ برطانوی سامراج کے مقابلے میں علمائے اُمّت نے پورے جذبے اور جوش و خروش سے کام لیا اور بیشتر معرکوں میں تو وہ خود میدان میں اُتر کر باطل کی قوتوں سے نبرد آزما ہوئے۔

۶۔ چونکہ انگریزوں نے یہ ملک مسلمانوں سے چھینا تھا اور مسلمانوں ہی نے ان کے خلاف مسلسل اور متواتر مزاحمت کی تھی اس لئے وہ مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے۔ البتہ دوسری اقوام جن میں ہندو قوم کی بھاری اکثریت تھی ان کے بغض و عناد سے محفوظ رہیں۔

اسلامی تحریکوں کی مشترکہ بنیاد

غلامی کے دور میں اس برصغیر میں ابھرنے والی اسلامی تحریکوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہر تحریک کی بنیاد مذہب پر تھی۔ برصغیر میں مغل حکومت کے آخری دور میں مسلمان اخلاق کی انتہائی پستیوں میں گر گئے تھے۔ اس لئے ہمارے جتنے قومی رہنما بلکہ عسکری رہنما بھی اُٹھے انہوں نے قوم کو سب سے پہلے اس کی اخلاقی پستی کی طرف متوجہ کیا۔ تحریکِ مجاہدین جو ایک عسکری تحریک کی صورت میں دنیا کے سامنے ابھری تھی وہ ایک دینی اور اخلاقی تحریک بھی تھی۔ اس تحریک کے دو بڑے رہنما سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جو میدانِ جنگ میں افواج کے سالار اور ایوانِ حکومت میں اعلیٰ پائے کے منتظم تھے وہ اسلامی تعلیمات کے میدان میں بہت بڑے دینی مصلح بھی تھے۔

بنگال کی فرائضی تحریک بھی حقیقتاً تحریک مجاہدین کا مشرقی بازو تھی۔ جیسا کہ اس تحریک کے نام ہی سے ظاہر ہے تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہ مسلمانوں کو فرائض دین کی طرف متوجہ کر کے سیدھے راستے پر لانا چاہتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بھی دینی جذبہ پیش پیش رہا۔ اگرچہ اس جنگِ آزادی میں کچھ ہندو بھی شامل ہوئے لیکن جنگ کا انداز سراسر اسلامی تھا۔ جب میرٹھ سے فوجی دلّی پہنچے تو جنرل بخت خاں نے دہلی کے سرکردہ علماء سے مشورہ کیا چنانچہ علماء نے اس جنگ کو جہاد قرار دیا اور تیس بڑے علماء کے دستخطوں سے جاری ہونے والا فتوائے جہاد دہلی کی جامع مسجد میں پڑھ کر سنایا گیا اور پھر اسے چھاپ کر بڑے پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ لکھنؤ میں جنگ کے رہنما مولوی احمد اللہ شہید تھے جو بڑے پرجوش مسلمان تھے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں تحریکِ آزادی کے لئے ایک تنظیم قائم ہوئی جس کے علم بردار علماء دیوبند کے نامی گرامی سرخیل مولانا محمود الحسن دیوبندی تھے اس تنظیم کا نام غدر پارٹی تھا۔ اس پارٹی میں کئی نامی گرامی علماء شامل تھے جن میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مقبول الرحمٰن کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس پارٹی میں بڑے بڑے ہندو سیاسی لیڈر بھی شامل ہوئے جن میں ایم کے گاندھی، موتی لال نہرو، لاجپت رائے، بابو راجندر پرشاد اور مسٹر ہردیال نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ یہ ہندو رہنما آگے چل کر تاریخی شخصیتیں بن گئے لیکن پارٹی کی سیادت اور رہنمائی مسلمان علماء کے ہاتھ میں تھی۔ اس پارٹی نے غیر ممالک سے جرائد اور اخبار بھی جاری کئے جن کے ناموں ہی سے اُن کا اسلامی مزاج واضح تھا۔ مثلاً ٹوکیو سے رسالہ "اسلامک فریٹرنٹی سوسائٹی" چین سے ایک جریدہ "الیقین"۔ پیرس سے اخبار "انقلاب"

اور واشنگٹن سے اخبار "غدر" اور "انقلاب" جاری کئے گئے!

تین عظیم مواقع

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد قدرت نے مسلمانوں کو کم از کم تین بڑے موقعے ایسے دیئے کہ وہ سنبھل کر برصغیر میں اپنی حاکمانہ حیثیت کی بازیافت کر سکتے تھے لیکن افسوس کہ یہ تینوں موقعے انہوں نے محض اپنی ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے ضائع کر دیئے۔ پہلا موقع ۱۷۶۱ء میں آیا جب احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کے چھ لاکھ سپاہیوں پر مشتمل لشکر کو شکست فاش دے کر ان کا زور ہمیشہ کے لئے توڑ دیا تھا۔ اگر ابدالی مغل حکومت کو ہٹا کر خود دہلی کے تخت پر بیٹھ جاتا تو مسلمانوں کے اقتدار کو کوئی قوت متزلزل نہ کر سکتی۔ دوسرا موقع اس صدی کے اواخر میں آیا تھا جب سلطان ٹیپوؒ نے انگریزوں کی عسکری قوّت کو نہایت جواں مردی سے للکارا تھا۔ اگر برصغیر کے دوسرے مسلمان نواب اور حکمران ٹیپو سلطان کی مدد کرتے اور باہم متحد ہو کر اس سفید سامراجی قوّت کا مقابلہ کرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ برصغیر انگریزوں کے وجود سے پاک ہو جاتا۔ تیسرا موقع ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی صورت میں آیا تھا۔ اگر مغل دربار کے بعض سرکردہ امراء درپردہ انگریزوں کے آلۂ کار نہ ہوتے اور جنرل بخت خان کی قیادت میں جہاد جاری رہتا تو کامیابی کی توقعات تھیں۔

دو قومی نظریہ

یوں تو مسلمان اور ہندو اپنی معاشرت، لباس، رہن سہن، کھانے پینے تہذیبی اور مذہبی اقدار میں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھے کہ ہزار برس ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود ان میں یکسانیت کا رنگ پیدا نہ ہو سکا۔ مگر جب تک مسلمانوں کا اقتدار رہا اُن

کے باہمی اختلافات کھل کر سامنے نہ آئے کیونکہ مسلمان حاکم کی حیثیت سے رواداراور ہندو محکوم کی حیثیت سے اطاعت شعار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد جلد ہی ہندوؤں کا تعصب اُبھر کر سامنے آنے لگا۔ یہ تعصب سب سے پہلے زبان کے معاملے میں نمودار ہوا۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے کچھ بااثر ہندوؤں نے یہ تحریک شروع کی کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اس لئے دفتروں اور عدالتوں میں ہندی زبان کو رائج ہونا چاہیئے جو دیوناگری رسم الخط میں ہو۔ وہاں کے کلکٹر انتھونی میکڈانل نے ہندوؤں کا ساتھ دیا اور اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو عدالتوں اور دفتروں میں مروج کرادیا۔ ۱۸۹۵ء میں یہی شخص یو۔ پی کا لیفٹیننٹ گورنر بن کر آیا تو اس نے پورے صوبے کے لئے یہی احکام جاری کر دیئے۔

سرسید احمد خان جو ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے ۱۸۶۷ء کے واقعہ سے سخت بددل ہوئے وہ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ چلنا اور مل کر متحد رہنا محال ہے"۲ انہی دنوں میں جب کہ ہندی اُردو کا تنازعہ چل رہا تھا سرسید کو ایک انگریز افسر مسٹر شیکسپیئر سے ملنے کا اتفاق ہوا انہوں نے اس سے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں گفتگو کی تو وہ نہایت حیرانی کے عالم میں بولا" یہ پہلا موقع ہے کہ میں آپ سے صرف مسلمانوں کی تعلیم کی بات سُن رہا ہوں ورنہ اس سے پہلے آپ ہمیشہ ہندوستان کے تمام باشندوں کی مجموعی تعلیمی ترقی کی بات کیا کرتے تھے۔ سرسید احمد خان نے جواب دیا اس لئے کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آئے گا۔ جو زندہ رہے گا دیکھے گا"۔ شیکسپیئر نے کہا" اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت

افسوس ناک بات ہو گی سر سید نے جواب دیا مجھے بھی افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر پورا یقین ہے"[۴]
اسی زمانے میں ہندوؤں نے جگہ جگہ مسلمانوں کے خلاف فسادات کا سلسلہ شروع کر دیا۔
بڑے بڑے ہندو لیڈروں نے جن میں بال گنگا دھر تلک سب سے نمایاں تھا شیواجی کو اپنا قومی ہیرو قرار دے کر "شیواجی ڈے" اور "جشن گنپتی" کی تقریبیں منانا شروع کر دیں۔ اور ان تقریبوں میں سخت زہریلی تقریریں کرنا شروع کر دیں۔ شیواجی کے متعلق تقریر کرتے ہوئے تلک یہاں تک کہنے سے نہ چوکتا تھا کہ

"شیواجی نے افضل خان کو دوسروں کی بھلائی کے لئے نہایت اچھے ارادے سے قتل کیا تھا اگر ہمارے گھروں میں چور گھس آئیں اور ہماری کلائیوں میں ان کو بھگانے کے لئے کافی طاقت نہ ہو تو ہمیں بلا جھجک انہیں بند کر کے زندہ جلا دینا چاہیئے"[۴]

دوسرے ہندو لیڈر جو اعتدال پسند تھے وہ بھی ہندو ازم کے فروغ اور بالادستی کے لئے اسی طرح کے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ مثلاً ڈلیانی کے قول کے مطابق

"انتہا پسند رہنما ہندوؤں کی ویدک زمانہ کی یادوں بعض اشوک اور چندر گپت کے زمانے کے شاندار ابواب رانا پرتاپ اور شیواجی کے عظیم کارناموں اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور ۱۸۵۷ء کے دوسرے رہنماؤں کی حب الوطنی کو دوبارہ زندہ کر رہے ہیں"[۵]

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے واقعے نے ہندو تعصب کے زہر کو بالکل واضح کر دیا۔ یہ تقسیم محض انتظامی امور میں سہولت کے پیش نظر عمل میں لائی گئی تھی۔ اور اس سے اتفاقاً مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو عددی اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ ہندوؤں نے اس تقسیم پر اتنا شور و غل برپا کیا اور ایسی دہشت گردیوں کا سلسلہ شروع کر دیا کہ بالآخر ۱۹۱۱ء میں حکومت

نے تقسیم کو منسوخ کر دیا۔ تقسیم بنگال کے بارے میں معتدل مزاج ہندو لیڈروں نے بھی غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ مثلاً سر بندر ناتھ بینرجی جو ایک کانگریسی رہنما تھے اور جنہیں قائداعظم ابتدائی سیاسی زندگی میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس سلسلے میں کہا

"یہ اعلان ہم پر بم کی طرح گرا۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہماری توہین اور تذلیل کی گئی ہے اور ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ بنگلہ بولنے والی آبادی کی روز افزوں یک جہتی اور بیداری ضمیر پہ جان بوجھ کر ایک کاری وار کیا گیا ہے۔"[۶]

اس ضمن میں ہندوؤں کے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے دو ہندو مورخ لکھتے ہیں۔

"ہندوستان (ہندوؤں) کے لئے یہ چیز ایک قوم کی تقسیم کے مترادف تھی۔ ایک یک رنگ قوم کی تقسیم کرنے کی کوشش، بنگالیوں کی روایات، تاریخ اور زبان پر ناپاک حملہ تھا۔ تقسیم نے بنگال کے ہندوؤں کو دو ٹکڑے کر دیا۔ مشرقی بنگال میں غیر بنگالی (مسلمان) عددی اعتبار سے ان پہ غالب آ گئے۔"[۷]

تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کی زبردست شورش نے برصغیر کے مسلمانوں کے اندر من حیث القوم اپنے تحفظ کا احساس پیدا کر دیا۔ چنانچہ مسلمان کانگریس سے بددل ہوتے لگے اور بہت سے مسلمانوں نے کانگریس کی رکنیت ترک کر دی۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۰۵ء میں بنارس کے مقام پہ کانگریس کے اجلاس میں شامل ہونے والے ۷۵۶ مندوبین میں سے صرف ۱۷ مسلمان تھے۔[۸]

کانگریس کے فرقہ وارانہ مزاج کا ردِ عمل یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ سیاسی تنظیم بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں بنگالی مسلمان پیش پیش تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں نواب سلیم اللہ خان نے بنگال میں محمڈن پراونشل یونین بنائی۔ اس سے اگلے سال

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ملک بھر کے مسلمان رہنماؤں کا ایک نمائندہ وفد جو ۳۵ ارکان پر مشتمل تھا اور جس کی قیادت سر آغا خان کر رہے تھے شملہ کے مقام پہ لارڈ منٹو سے ملا اور ایک محضر نامہ پیش کیا جس میں زیادہ زور اس بات پہ دیا گیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی آبادی چھ کروڑ بیس لاکھ افراد سے متجاوز ہے اس لئے ہم گوش گزار کرنا چاہتے تھے کہ نمائندگی کے کسی بھی نظام کے تحت چاہے وسیع ہو چاہے محدود ایک ایسی قوم جو عددی اعتبار سے روس کو چھوڑ کر یورپ کی ہر اوّل درجہ کی طاقت کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے جائز مطالبہ کر سکتی ہے کہ اسے مملکت میں ایک اہم عامل کی حیثیت سے مناسب انداز میں تسلیم کیا جائے؟

ہر چند اس محضر نامے کے جواب میں وائسرائے نے کوئی ٹھوس وعدہ نہ کیا لیکن اس نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ایک قوم کی حیثیت سے ہر انتظامی ادارہ میں ان کے حقوق اور مفادات کی محافظت کی جائے گی[1]

مسلم لیگ کا قیام

ان حالات میں ایک علیحدہ مسلم سیاسی جماعت کے قیام کے لئے نواب سلیم اللہ خان نے اپنی تجاویز ایک سرکلر کی صورت میں ملک بھر کے مسلمان زعماء کو ارسال کیں۔ جب دسمبر ۱۹۰۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں بڑے بڑے زعماء ڈھاکہ پہنچے تو یہ تجاویز موضوع بحث بنیں۔ اور ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو کانفرنس کے بعد ایک اجلاس میں جو نواب محسن الملک کی صدارت میں ہوا نواب سلیم اللہ کی تحریک اور حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خان کی تائید سے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جس کے اغراض و مقاصد مختصراً حسب ذیل تھے:

۱۔ برطانوی حکومت کے ساتھ وفاداری کا اظہار

۲۔ مسلمانان ہندوستان کے حقوق اور مفادات کی نگہداشت

۳۔ دوسری قوموں کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں تعصب کی روک تھام"

اس وقت تک قائداعظم کانگریس کے رکن تھے۔ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کا المیہ ہوا تو لیگ کے جنرل سیکرٹری سید وزیر حسن اور مولانا محمد علی مسلمان عوام کے نقطۂ نظر کو برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان اور عوام کے سامنے پیش کرنے کے لئے لندن گئے۔ مسٹر جناح بھی ان دنوں لندن میں تھے وہ ہندوستان کی سیاست میں ایک اہم مقام حاصل کر چکے تھے اس لئے سید وزیر حسن اور مولانا محمد علی نے ان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہیں لیگ میں شمولیت کی دعوت دی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اسی سال لیگ نے اپنے منشور میں ترمیم کر کے مکمل آزادی کے حصول کو اپنا مطمح نظر قرار دیا تھا۔

اس زمانے میں کسی شخص پر یہ پابندی نہ تھی کہ وہ بیک وقت کانگریس اور مسلم لیگ کا رکن نہیں ہو سکتا۔ اس لئے دونوں سیاسی جماعتوں میں پورا پورا تعاون تھا۔ لوگ کانگریس کے جلسوں میں بھی شامل ہوتے تھے اور مسلم لیگ کے جلسوں میں بھی۔ اس طرح دونوں بڑی قوموں کے مابین اتفاق اور تعاون کی فضا قائم تھی۔ قائداعظم ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ انہوں نے دونوں جماعتوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے سالانہ اجلاس ایک ہی مقام پر اور ساتھ ساتھ تاریخوں میں رکھا کریں اس طرح لیگ کے زعما کو کانگریس کے جلسوں میں اور کانگرسی لیڈروں کو مسلم لیگ کے جلسوں میں شامل ہونے کے عام مواقع ملتے تھے اور وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو بآسانی سمجھ سکتے تھے۔

میثاق لکھنؤ

اسی باہمی تعاون نے خیر سگالی کی وہ عمدہ فضا پیدا کی جس کے نتیجے میں دونوں جماعتوں

کے سالانہ جلسوں میں جو ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کے مقام پر ہوئے دونوں جماعتوں کے مابین ایک سیاسی سمجھوتہ طے پایا جسے میثاق لکھنؤ کہا جاتا ہے۔ اس میثاق کے ذریعے مسلمانوں نے آل انڈیا بنیادوں پر اقلیت ہونے کے باوجود اکثریت کے لئے بڑی مروت اور رواداری کا اظہار کیا۔ چنانچہ انہوں نے پنجاب میں چھپن فیصد ہونے کے باوجود نیابتوں میں پچاس فی صد جو عملاً اس تناسب سے بھی کم ہو جاتی تھیں اور بنگال میں صرف چالیس فی صد قبول کریں۔ اس طرح ان دونوں صوبوں میں اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ عملی طور پر اقلیت میں بدل گئے۔ اور اس تناسب کا مستقبل [illegible] یخ پر بڑا ناخوشگوار اثر ہوا۔ مگر اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کانگریس نے ہندوؤں اور مسلمانوں و الگ قوموں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ اور مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی فعال سیاسی جماعت قرار پائی۔

میثاق لکھنؤ کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کی طرف سے مشترکہ رپورٹ حکومت کو بھیجی گئی جو آئندہ اصلاحات میں ممد و معاون ثابت ہوئی مگر اس مشترکہ فیصلے کو جہاں مسلمانوں نے پنجاب اور بنگال میں نیابتی اکثریت میں نقصان اٹھانے کے باوجود خوش دلی سے قبول کیا وہاں کانگریس نے اسے اس ذہنی تحفظ کے ساتھ قبول کیا کہ دس سال کے بعد جب مزید اصلاحات اور اختیارات کے لئے گفت وشنید ہو گی تو جداگانہ نیابت کا اصول ختم ہو جائے گا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے نقطۂ نظر کا اندازہ مندرجہ ذیل دو اقتباسات سے بخوبی ہو جاتا ہے

۱۹۱۷ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبے میں راجہ صاحب محمود آباد نے کہا

"ملک کے مفادات سب چیزوں پر مقدم اور اہم ہیں ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ ہم مسلمان پہلے ہیں یا ہندوستانی امر واقعہ یہ ہے کہ ہم ہر دو ہیں۔ ہمارے لئے اولیت کا سوال بے معنی ہے۔ لیگ نے مسلمانوں کے اندر قربانی کا جذبہ پیدا کیا ہے اور یہ

جذبہ ملک اور مذہب دونوں کے لئے ہے"[۱۲]

اس کے برعکس ہندوؤں کے ایک لیڈر لال بہادر لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ تصفیوں کے متعلق کانگرس عام طور پر خود فریبی کا شکار رہی ہے۔ اس چیز سے زیادہ خود پسندانہ کوئی کام نہ ہو سکتا تھا کہ اپنی پیدائش کے بعد صرف دس سال کے عرصہ میں جداگانہ انتخاب کا مسئلہ کالعدم ہو جائے گا۔ اس برائی کا آغاز ہی میں قلع قمع ہو سکتا تھا لیکن اسے اس وقت تک بڑھتے چلے جانے کی اجازت دی گئی جب یہ چیز پاکستان کے مطالبے کے لئے پہلے مرحلہ کی صورت اختیار کر گئی"[۱۳]

تحریک خلافت سے نہرو رپورٹ تک

۱۹۱۶ء تک ہندوستان کی سیاست دونوں بڑی قوموں کے باہمی تعاون کے ساتھ پیش رفت کر رہی مگر مہاتما گاندھی سیاسی افق پر نمودار ہوئے تو سیاسی فضا دھندلانے لگی۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے سانحہ اور اس کے بعد تحریک خلافت سے گاندھی نے خوب فائدہ اٹھایا۔ انڈیا آفٹر ۱۹۲۶ء کے ہندو مصنفین لکھتے ہیں

"مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع کی تھی اور مہاتما گاندھی نے فوراً اس تحریک کو اپنے ساتھ ہم آہنگ کر لیا تھا۔ مہاتما گاندھی کو یقین تھا کہ ان حالات کے تحت اگر کانگریس عدم تعاون کی تحریک شروع کر دے تو اس امر کا پورا امکان ہے کہ مسلمان کانگریس کے ساتھ تعاون کریں گے اس طرح کے سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیئے"۔[۱۴]

مہاتما گاندھی نے تحریک خلافت کا سہارا لے کر اپنی لیڈرانہ پوزیشن بڑی مستحکم کر لی۔

اپنی اس مستحکم پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ مسز اینی بیسنٹ کو خود اپنی قائم کردہ "ہوم رول لیگ" کو چھوڑنا پڑا اور قائداعظم کو پہلے ہوم رول لیگ اور پھر کانگریس سے مستعفی ہونا پڑا۔ جب گاندھی نے دیکھا کہ تحریکِ خلافت کے سامنے برطانوی سامراج کا جہاز ڈگمگانے لگا ہے اور انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ مسلمان سیاسی طور پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو انہوں نے اچانک عدم تعاون کی تحریک کو ختم کر دیا۔ اسی زمانے میں ہندوؤں کی طرف سے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کی گئیں۔ اس طرح ملک میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ انڈیا آفٹر ۱۵۲۶ء کے ہندو مصنفین لکھتے ہیں۔

"جب مہاتما گاندھی کے ہاتھوں عدم تعاون کی تحریک ختم ہوئی تو ملک کے مختلف حصوں میں فسادات شروع ہو گئے۔ اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان افتراق پیدا ہوا۔ ہندوؤں کے شدھی اور سنگھٹن کے پروگرام نے بھی مسلمانوں کو ہندوؤں کا مخالف بنا دیا۔"[۱۵]

ان فسادات کی کیفیت بیان کرتے ہوئے چوہدری خلیق الزمان لکھتے ہیں۔

"عام طور پر فسادات ایسے علاقوں میں ہوئے تھے جہاں مسلمان بہت قلیل تعداد میں ہوتے تھے۔ یوپی کے مشرقی علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی چار سے لے کر چھ سات فی صد تھی۔ یو۔پی کے مغربی علاقوں کے مقابلے میں جہاں مسلمان آبادی بیس فی صد سے زیادہ تھی بہت زیادہ فسادات ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جارحیت ہمیشہ ہندو اکثریت کی طرف سے ایسے علاقوں میں ہوئی تھی جہاں اقلیت اتنی کمزور ہوتی کہ اپنا بچاؤ نہ کر سکتی تھی۔"[۱۶]

اس زمانے میں قائداعظم مرکزی کونسل کے رکن منتخب ہوتے رہے اور مسلم لیگ کے ساتھ ان کی

وابستگی بڑھتی چلی گئی تاہم کانگرس سے ایک بار مستعفی ہونے کے بعد انہوں نے دوبارہ کبھی اس میں یا اس کے لیڈروں سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ مرکزی کونسل میں اس زمانے میں تین گروپ بن گئے تھے پہلے گروپ میں تمام یورپین اور نامزد ارکان شامل تھے دوسری سوراج پارٹی تھی جس میں کانگریسی ارکان شامل تھے۔ تیسری انڈی پنڈنٹ یا آزاد پارٹی تھی جس میں زیادہ تر مسلمان ارکان شامل تھے اس پارٹی کے لیڈر قائداعظم محمد علی جناح تھے جن کی قیادت میں پارٹی کو توازن اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ اور یہ پارٹی کسی مسئلے پر جس پارٹی کا ساتھ دیتی رہی آہنی فتح حاصل کر لیتی تھی۔

اس زمانے میں قائداعظم نے ہندو مسلم سمجھوتے کے لئے ایک اور کوشش کی۔ اس کوشش کا آغاز ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو تمام سیاسی نقطۂ ہائے نظر رکھنے والے مسلمان رہنماؤں کی ایک کانفرنس سے ہوا جس کی صدارت قائداعظم نے کی تھی۔ اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل شرائط پر مسلمان رہنماؤں نے جداگانہ طریق انتخاب سے دست برداری پر بھی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔

۱۔ سندھ کو صوبہ بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔

۲۔ شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات اسی انداز سے ہونی چاہئیں جس طرح ملک کے باقی کسی صوبے میں ہوں۔ سندھ، سرحد اور بلوچستان میں مسلمان غیر مسلم اقلیتوں کو وہی مراعات دینے کے لئے تیار ہیں جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہندو اکثریت مسلمان اقلیتوں کو دینے کے لئے تیار ہو۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کے تناسب کے مطابق ہو مرکزی قانون ساز ادارے میں مسلمانوں کا تناسب نمائندگی ایک تہائی سے کم نہیں ہونا چاہیئے اور وہ تناسب بھی مخلوط انتخاب کے ذریعے ہو۔[۱۷]

ان نہایت معقول اور منصفانہ شرائط کو اگر کانگرس کی طرف سے مان لیا جاتا تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون اور خلوص کی ایک عمدہ فضا قائم ہو جاتی۔ مگر کانگرس پر متعصب ہندو رہنماؤں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ کانگرس نے ان شرائط کو قبول نہ کیا اور اعتماد اور اتحاد کے حصول کا ایک اور موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔

سائمن کمیشن

۱۹۲۸ء کے اوائل میں برطانوی حکومت کا قائم کردہ ایک کمیشن ہندوستان کو مزید آئینی اصلاحات دینے کے بارے میں چھان بین کے لئے ہندوستان آیا۔ اس کمیشن کا سربراہ سر جان سائمن تھا اس لئے کمیشن کا نام ہی سائمن کمیشن پڑ گیا۔ کمیشن میں ایک بھی ہندوستانی رکن نہ تھا گویا جن لوگوں کے بارے میں کمیشن کی سفارشات پر فیصلے ہونے تھے ان کی کوئی آواز ہی نہ تھی۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ تاہم کمیشن نے اپنا کام کیا اور رپورٹ بھی مرتب کی۔

نہرو رپورٹ

۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں منعقد ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس کی ایک قرارداد کے تحت ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تاکہ فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے سفارشات مرتب کرے جن کی بنیاد پر آئندہ آئینی اصلاحات کے لئے حکومت برطانیہ سے گفت و شنید کی جائے۔ اس کمیٹی کے سربراہ پنڈت موتی لال نہرو (اندرا گاندھی کے دادا) تھے اس لئے اسے نہرو کمیٹی کہا جاتا ہے۔ اس کمیٹی نے تقریباً تین مہینے کام کرنے کے بعد جو رپورٹ مرتب کی اس میں مسلمانوں کو آئینی نیابت میں کسی قسم کی رعایت دینے سے انکار کر دیا گیا اور آبادی کے تناسب کی بنیادوں پر مخلوط انتخاب کے ذریعے نمائندگی کی سفارش کی گئی۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا۔

"ہم نے جو اصول اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلم اقلیت کا اس طرح کا

تحفظ مہیا کیا جائے گا وہ حتمی طور پر ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہونا چاہیے۔ مسلمان برطانوی ہند میں ایک چوتھائی سے کم تعداد میں ہیں لہٰذا انہیں اس تناسب سے زیادہ نمائندگی کے تحفظ کا حق نہیں دیا جاسکتا۔"[۱۸]

مسلمانوں کے خدشات کا مذاق ان الفاظ میں اڑایا گیا۔

"مجموعی طور پر ہندوستان میں اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو اندیشہ ہے کہ اکثریت انہیں ہراساں کرے گی اور اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہوں نے ایک انوکھی تجویز پیش کی ہے کہ انہیں کم از کم ہندوستان کے بعض حصوں میں بالادستی حاصل ہو"۔[۱۹]

اس رپورٹ کی قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ اس میں طے شدہ امور کو از سر نو اختلافی امور بنا دیا گیا جداگانہ انتخابات جو ۱۹۰۹ء سے ہوتے چلے آرہے تھے اور ان کی وجہ سے آئینی امن و سکون پیدا ہوا تھا انہیں ختم کر کے مخلوط طریق انتخاب تجویز کیا گیا اور مسلمانوں کے جائز خدشات کو دور کرنے کی بجائے ان خدشات کا مذاق اڑایا گیا اور سب سے بڑی ستم ظریفی یہ روا رکھی گئی کہ ما بقی اختیارات (RESIDUARY POWERS) جو ہر وفاقی نظام میں صوبوں کے پاس ہوتے ہیں انہیں بھی مرکز کی تحویل میں دے دیا گیا تاکہ مرکز مضبوط ہو جائے اور صوبوں کو کوئی اختیار حاصل نہ رہے۔

۲۸ اگست کو یہ رپورٹ لکھنو کے مقام پر ہونے والی "اتحاد کانفرنس" (؟) میں پیش کی گئی اور چونکہ اس کانفرنس میں ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی اس لئے اسے منظور کر لیا گیا۔ اور رپورٹ کو حتمی طور پر منظور کرنے کے لئے ۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء کو کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن بلایا گیا

قائداعظم ان دنوں انگلستان میں تھے جب انہیں تمام حالات سے آگاہی ہوئی تو وہ

واپس ہندوستان آگئے تاکہ آئینی تبدیلیوں کے لئے ان ابتدائی کوششوں کے زمانے میں قوم کی صحیح رہنمائی کر سکیں۔

آل پارٹیز کانفرنس نے کنونشن میں شرکت کے لئے قائداعظم کو بھی دعوت دی لیکن انہوں نے اس دعوت کو اس بنا پر رد کر دیا کہ جب تک مسلم لیگ کونسل رپورٹ پر بحث کر کے کسی فیصلے پر نہ پہنچے وہ کنونشن میں شریک نہیں ہو سکتے۔

چنانچہ مسلم لیگ کی طرف سے تیئس افراد کا ایک وفد منتخب کیا گیا جس میں قائداعظم لیاقت علی خان، راجہ صاحب محمود آباد، مولانا ظفر علی خان، سیٹھ یعقوب حسن، تصدق احمد خان شروانی، چوہدری خلیق الزمان اور کئی دوسرے بڑے مسلمان رہنما شامل تھے ان رہنماؤں میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مسٹر ایم سی چھاگلہ جیسے حضرات بھی تھے جو کانگری ذہن رکھتے تھے، تاہم اس کے لیڈر قائداعظم تھے۔ لیگ کے اجلاس سے پہلے قائداعظم نے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے رہنماؤں سے دیر تک تبادلہ خیال کیا۔

آل پارٹیز کنونشن میں قائداعظم بڑے پرجوش اور پُراعتماد طریقے سے پہنچے اور وفد کے قائد کی حیثیت سے انہوں نے مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کے بارے میں نہایت مدلل تقریر کی جس سے نہ صرف اکثر و بیشتر مسلمان نمائندے ان کے نقطۂ نظر سے متفق ہو گئے بلکہ منصف مزاج ہندو بھی قائل ہوئے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیاکر جیسے معتدل مزاج ہندوؤں نے اپنی تقریروں میں استخفافی اور استہزائی انداز اختیار کیا۔ جیاکر نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے کہا کہ ہمارے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، سر علی امام اور ڈاکٹر کچلو جیسے مسلمان موجود ہیں جو نہرو رپورٹ کے حق میں ہیں اس لئے مسٹر جناح مسلمانوں کی صرف ایک چھوٹی سی اقلیت کے نمائندہ ہیں۔[۲۰]

اس رپورٹ کو منظور کرانے کے لئے مسٹر گاندھی نے قرار داد پیش کی جس میں کمیٹی کو ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لئے ایک بڑا کارنامہ کہا گیا اور سفارشات کے معاملے میں کمیٹی کے معنوی اتحاد پر اسے مبارک باد پیش کی گئی۔[۲۱]

۱۳ مارچ ۱۹۲۹ء کو مرکزی کونسل کا بجٹ اجلاس شروع ہوا جس میں نہرو رپورٹ پر بھی بحث ہوئی اس میں قائداعظم نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمانوں نے اس رپورٹ کو قبول نہیں کیا۔ موتی لال نہرو نے کہا "ہندوستانی مسلمانوں کے ایک حصے نے" مولوی محمد یعقوب نے کہا "صرف چند انفرادی مستثنیات کے سوا باقی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے اسے قبول نہیں کیا" مگر پنڈت نہرو اپنی ہی ہانکتے رہے آخر قائداعظم نے نہایت پر وثوق انداز میں کہا "بس بہت باتیں ہو چکیں میں ہر کسی کو چیلنج کرتا ہوں کہ اس سوال پر کہ آیا یہ رپورٹ مسلمانوں کو قبول ہے یا نہیں استصواب رائے کرالے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ رپورٹ مسلمانوں کو قبول نہیں"۔[۲۲]

چودہ نکات، خطبہ الہ آباد گول میز کانفرنس

مارچ ۱۹۲۹ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں جہاں نہرو رپورٹ کو مسترد کیا گیا وہاں ایک اور قرار داد بھی منظور کی گئی جس میں چودہ ایسے معاملات کے متعلق فیصلہ کن انداز میں اظہار رائے کیا گیا جو مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں اہمیت کے حامل تھے۔ انہیں عرف عام میں مسٹر جناح کے چودہ نکات کہا جاتا ہے۔[۲۳]

مئی ۱۹۲۹ء میں پارلیمنٹ کا انتخاب ہوا تو وہاں لیبر پارٹی کی حکومت قائم ہوئی جس کے سربراہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ تھے۔ قائداعظم نے ۲۹ جون ۱۹۲۹ء کو ریمزے میکڈانلڈ کو ایک خط لکھا جس میں ہندوستان کے مسئلہ پر حقیقت پسندانہ غور کر کے یہاں فوری طور پر ایک ذمہ دار حکومت قائم کرنے پر زور دیا گیا۔ اس کے بعد حکومت برطانیہ کی طرف سے گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ کانگریس نے سودے بازی کی غرض سے اس میں اپنے نمائندے بھیجنے کے لئے چند پیشگی شرائط پیش

کیں جو حکومت برطانیہ کو منظور نہ تھیں۔ چنانچہ کانگرس نے اپنے نمائندے نہ بھیجے۔ اپنی شرائط کو سیاسی قوت سے منوانے کے لئے گاندھی نے ۱۹۳۰ء کے شروع میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ مسلمان اجتماعی طور پر اس تحریک سے الگ رہے۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو علامہ اقبال نے اپنے صدارتی خطبہ میں پہلی بار "مسلم ہندوستان" کا تصور پیش کیا جو تصور پاکستان کی بنیاد بنا۔ آپ نے فرمایا تھا۔

"ہندوستان مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب کی پیروی کرنے والے مختلف نسلوں پر مشتمل انسانی گروہوں کا ایک برعظیم ہے ان کا طرز عمل ایک مشترکہ نسلی شعور کے ذریعے متعین نہیں ہوتا خود ہندو بھی ایک وحدانی گروہ کی صورت میں متشکل نہیں۔ جدا جدا قومیتی گروہوں کو تسلیم کئے بغیر یورپی جمہوریت کے اصول کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہوتا۔ اس لئے ہندوستان کے اندر ایک مسلم ہند کے لئے مسلمانوں کا مطالبہ بالکل جائز ہے" [۲۴]

دوسری گول میز کانفرنس میں اقبال نے مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے کہا تھا۔

"ایک متحدہ ہندوستان کے تصور پر آئین کی بنیاد رکھنا یا برطانوی جمہوری تفصیلات کی بنیاد پر طے شدہ اصولوں کو اس آئین پر منطبق کرنا نادانستہ طور پر ملک کو خانہ جنگی کے لئے تیار کرنے کے مترادف ہے۔ میں پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبے سندھ اور بلوچستان کو ایک واحد ریاست کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کی تشکیل مسلمانوں کی معین تقدیر معلوم ہوتی ہے" [۲۵]

گول میز کانفرنس میں ہندوستانی نمائندے کسی ایک فیصلے پر متفق نہ ہو سکے اس لئے بالآخر حکومت برطانیہ نے اپنا فیصلہ کمیونل ایوارڈ کی صورت میں دیا۔ اس ایوارڈ کی رو سے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ اچھوتوں کو بھی جداگانہ نمائندگی کا حق دیا گیا۔ اس فیصلے نے گاندھی کو سرتاپا اضطراب بنا دیا اور انہوں نے مرن برت رکھنے کی دھمکی دی اور نہ صرف دھمکی دی بلکہ عملاً شروع بھی کر دیا۔ اس پر ہندو لیڈروں نے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اور اچھوتوں کو علیحدہ نمائندگی کے حق سے دستبردار ہونے پر مجبور کرنے لگے۔ اچھوت لیڈر جانتے تھے کہ اگر وہ ہندوؤں کی بات نہ مانیں گے تو ملک بھر میں اچھوتوں کا جینا حرام کر دیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے پونا کے مقام پر ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے اپنے علیحدہ تشخص کو ختم کر دیا اور حکومت برطانیہ نے اس سمجھوتے کو تسلیم کر لیا۔

صوبائی خود مختاری سے قرارداد پاکستان تک

کمیونل ایوارڈ کی بنا پر آئینی اصلاحات کا مسودہ جب ہندوستان کی مرکزی کونسل میں زیر بحث آیا تو قائداعظم کے اعلیٰ سیاسی تدبر کے جوہر کھل کر سامنے آئے۔ انہوں نے ان اصلاحات کو تین حصوں یعنی کمیونل ایوارڈ، صوبائی خود مختاری اور مرکزی وفاق میں منقسم کر کے تین ترامیم پیش کیں جو تینوں منظور ہو گئیں۔ یہاں اس کی تفصیلات پر بحث کی گنجائش نہیں۔ تاہم ۱۹۳۵ء کا قانون ہند انہی ترامیم کی روشنی میں مرتب ہوا اور ۱۹۳۷ء کے اوائل میں عام انتخابات کے بعد یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو صوبائی خود مختاری کے دور کا آغاز ہوا۔

انتخابات کے نتیجے میں ہندو کانگریس کو ملک کے سات صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی اور انہوں نے صوبائی وزارتیں قائم کیں۔ اپنی کامیابی کے غرور میں ان وزارتوں نے مسلمانوں کے حقوق کو بری طرح پامال کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اُردو کی جگہ ہندی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا آغاز کر دیا۔ سکولوں میں "بندے ماترم" کا گیت گانے اور سرسوتی دیوی کو پرنام کرنے کی ہدایات جاری

کر دیں جس سے مسلمان بچوں کے جذبات اور عقائد مجروح ہونے لگے۔ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کو پامال کرنا شروع کر دیا اور مسلم اقلیتی صوبوں کے دور دراز مقامات پر مسلم کش فسادات شروع ہو گئے۔ جب اس طرح کی شکایتیں عام ہونا شروع ہوئیں تو مسلم لیگ نے پیرپور کے راجہ کی سرکردگی میں ایک انکوائری کمیٹی مقرر کی۔ جس نے آٹھ مہینے تک ملک کے مختلف حصوں میں دورہ کر کے کونسل کی ہدایت کے مطابق اپنی مفصل رپورٹ پیش کی۔

اس رپورٹ کے شائع ہونے پر ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں میں شدید اضطراب برپا ہوا مسلمان عوام کانگریس سے دل برداشتہ ہو کر جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو برطانوی حکومت نے ہندوستان کی تمام صوبائی حکومتوں سے تعاون کی درخواست کی۔ کانگریسی وزارتوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور مرکزی کانگریسی کمیٹی کی ہدایات پر ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو مستعفی ہو گئیں اس سے ایک آئینی بحران پیدا ہو گیا۔ قائداعظم نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو "یوم نجات" منائیں۔

ان حالات کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ برصغیر میں آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے لئے ایک واضح لائحہ عمل اختیار کریں۔ چنانچہ ۲۲ اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں وہ قرارداد پیش کی گئی جسے قرارداد پاکستان کہا جاتا ہے۔ اس قرارداد کا مختصر متن حسب ذیل ہے۔

"قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی نہایت سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اس ملک کے لئے کوئی آئینی منصوبہ نہ ہی قابل عمل ہو گا اور نہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول جب تک اسے اس بنیادی اصول پر استوار نہ کیا جائے کہ جغرافیائی طور پر متصل وحدتوں کی نشان دہی کر کے انہیں ضروری

علاقائی ردّو بدل کے ساتھ ایسے منطقوں میں تقسیم کردیا جائے جس سے کہ شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان کے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کو عددی اکثریت حاصل ہے ملاکر ان کا ایسا ریاستی وفاق (ریاستیں) قائم کیا جائے جس میں شامل ہونے والی وحدتیں آزاد اور خودمختار ہوں"۔ ۲۶

حوالہ جات

۱- دیکھئے قائداعظم محمد علی جناح۔ شخصیت و کردار۔ ص ۱۷

۲- تحریک و تاریخ پاکستان۔ محمد احسان الحق محمد شفیق علوی۔ علمی کتاب خانہ لاہور۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۶۔ ص ۱۵

۳- ایضاً۔ بحوالہ حیات جاوید از مولانا حالی

۴- HISTARY OF INDIA AFTER 1526 از مہاجن وسیٹھی۔ جلد دوم۔ ص ۴۴۶

۵- ایضاً

۶- محمد علی جناح از مطلوب الحسن سید۔ کالج ایڈیشن ۱۹۶۷۔ ص ۳۵۔

۷- انڈیا آفٹر ۱۵۲۶۔ مہاجن وسیٹھی۔ جلد دوم۔ ص ۲۴۳۔

۸- ملت کا پاسبان۔ مطبوعہ قائداعظم اکیڈمی کراچی ۱۹۸۲۔ ص ۴۵

۹- پاکستان موومنٹ۔ ہسٹاریکل ڈاکومنٹس۔ جی الانا۔ ص ۵۔

۱۰- APOLITICAL ST4DY OF PAKISTAN۔ صفدر محمود۔ ص ۷۔ نیز تفصیلات کے لئے دیکھئے "ملت کا پاسبان" ص ۴۵، ۴۶۔

۱۱- INDIA AFTER 1526۔ مہاجن وسیٹھی۔ جلد دوم۔ ص ۳۸۴۔

۱۲- مہاجن وسیٹھی۔ متذکرہ بالا۔ ص ۴۲۸۔

۱۳- ایضاً ص ۴۲۷

۱۴- ایضاً ص ۴۰۰

۱۵- ایضاً ص ۴۲۸

۱۶- چوہدری خلیق الزمان PATHWAY TO PAKISTAN ص ۱۷۰، ۱۷۱

۱۷- مطلوب الحسن سید- MUHAMMAD ALI JINNAH کا طبع ایڈیشن ۱۹۷۷ء- ص ۱۱۸

۱۸- ایضاً ص ۱۳۰

۱۹- ایضاً ص ۱۲۹

۲۰- رفیق افضل SELECTED SPEECHES AND STATEMENTS ص ۲۰۷

۲۱- ایضاً ص ۲۹۵

۲۲- تفصیلات کے لئے دیکھئے "ملت کا پاسبان" ص ۱۳۰ تا ۱۳۹

۲۳- چودہ نکات کی تفصیل کے لئے دیکھئے "ملت کا پاسبان" ص ۱۴۱، ۱۴۲۔

۲۴- مکمل خطبہ کے لئے دیکھئے FOUNDATIONS OF PAKISTAN VOL II
شریف الدین پیرزادہ ص ۱۵۳- ۱۷۱

۲۵- جی الانہ- قائداعظم جناح- ص ۲۳۲

۲۶- ایضاً ص ۳۱۹